بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ہمارے موجودہ صدرِ مملکت زبان کے استعمال کے معاملے میں تو مطلق العنان ہیں ہی، اس لیے ان کی زبان فیض ترجمان سے گفتنی اور ناگفتنی ہر طرح کی باتیں نکلتی رہتی ہیں۔ مگر مئی کے آخر میں انہوں نے مغربی جرمنی کے ایک اخبار نویس کو جو تفصیلی انٹرویو دیا ہے اس میں ایک بات ایسی کہی ہے جو دینی اور قومی نقطۂ نظر سے سخت قابلِ اعتراض ہے۔ ہم صدر صاحب کے اِس مزاج کو جاننے کے باوجود کہ وہ ترنگ میں آکر بعض اوقات بڑی عجیب و غریب باتیں کر جاتے ہیں، جن کے بارے میں وہ قطعی طور پر سنجیدہ نہیں ہوتے، مضطرب ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے سیاسی اور معاشی عزائم کے اظہار کے لیے ایک ایسی اصطلاح استعمال کی ہے جو ہمارے نزدیک بڑی معنی خیز ہے۔ اس سے پیشتر وہ اپنے ان عزائم کو سوشلزم کے لفظ سے ظاہر کیا کرتے تھے اور کبھی اسے مشرف باسلام کر کے اسلامی سوشلزم کہہ دیتے تھے۔ لیکن اب کی مرتبہ انہوں نے یہ اصطلاح ترک کر کے مارکسزم کی اصطلاح استعمال کی ہے اور اس کے ساتھ قوم کو یہ "مژدہ" بھی سنایا ہے کہ وہ اسلام کے معتقدات اور اس کی روایات کے ساتھ مارکسزم کی پیوند کاری کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اُن کے اس عزم کو دیکھتے ہوئے انسان کے ذہن میں بالکل ناگزیر طور پر دو احساسات اُبھرتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اُن کی نگاہ میں اسلام معاذ اللہ ایک نامکمل ضابطۂ حیات ہے جو اپنی تکمیل کے لیے مارکسزم کی پیوند کاری کا محتاج ہے، کیونکہ اگر وہ اسے مکمل ضابطۂ حیات سمجھتے تو پھر انہیں اسلام کے دینی معتقدات کے ساتھ کارل مارکس کی سیاسی اور معاشی تعلیمات کو جوڑ کر دینِ حق کو مکمل کرنے کی قطعاً ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ دوسرے احساس کے اُبھرتے ہی صاحبِ صدر کی بصیرت اور اُن کی معاملہ فہمی مشتبہ ہو جاتی ہے۔

وہ دین کے عالم نہ سہی، مغربی یونیورسٹیوں کے تربیت یافتہ تو ضرور ہیں۔ ان یونیورسٹیوں میں ایک طویل مدت گزارنے کے بعد ان کے اندر اتنی بصیرت تو پیدا ہو جانی چاہیے تھی کہ وہ اس سادہ سی حقیقت کو سمجھ سکیں کہ اوّل تو دو الگ نظاموں کے مابین، جو حیاتِ انسانی کے سارے گوشوں پر محیط ہوں، کسی قسم کی پیوندکاری کوئی مفید نتائج برآمد نہیں کر سکتی۔ لیکن خاص طور پر دو ایسے نظامہائے حیات جو اساسی تصورات سے لیکر زندگی کی عملی جزئیات تک کے معاملے میں ایک دوسرے سے نہ صرف مختلف ہوں بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہوں، کے مابین کوئی جوڑ لگا کر کسی مفید نتیجہ کی توقع کرنا سراسر خام خیالی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ اسلام ایک ایسا مکمل اور ہمہ گیر ضابطۂ حیات ہے جو پورے کا پورا خدا پرستی کی بنیاد پر استوار کیا گیا ہے۔ اس کے معتقدات، اس کا نظامِ اخلاق، اس کا نظامِ معیشت و معاشرت اور اس کا نظامِ سیاست، الغرض زندگی کے سارے شعبے عقیدۂ خدا پرستی کا عکس پیش کرتے ہیں۔

اسلام کے مقابلے میں مارکسزم ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جو اوّل تا آخر مادیت پرستی کی اساس پر قائم ہے۔ اس میں مادہ ہی کو تخلیق کی علتِ اولیٰ قرار دیکر فکر و عمل کے سارے ڈھانچے تیار کیے گئے ہیں۔ اس نظام کی رُو سے مادہ کے سوا اس کائنات کا کوئی خالق و مالک نہیں۔ اس وجہ سے خدا، حشر و نشر، وحی و الہام سب توہمات کا درجہ رکھتے ہیں۔ انسان کا مادی ماحول، جسے مارکس ذرائع پیداوار کا نام دیتا ہے، انسانی شعور اور اخلاق کی صورت گری کرتا ہے۔ ان ذرائع کی تبدیلی سے نہ صرف معیشت میں تبدیلی ہوتی ہے بلکہ اخلاق، معاشرت، قانون، سیاست، الغرض انفرادی اور اجتماعی زندگی کا پورا ڈھانچہ اُن کے مطابق بدل جاتا ہے۔ اس نظریے کی بنا پر دنیا کا کوئی اصول، خیر و شر کا کوئی پیمانہ بھی مستقل قدر و قیمت کا حامل نہیں بلکہ معاشی تبدیلیوں کے ساتھ یہ اصول اور پیمانے مسلسل بدلتے رہتے ہیں۔ اسی طرح حق و ناحق، خوب و ناخوب کا بھی کوئی قطعی اور حتمی معیار نہیں۔ ذرائع پیداوار انسانوں کے مابین جن معاشی روابط کی تشکیل کر دیں وہی ایک خاص وقت میں حق و انصاف کے معیارات قرار پاتے ہیں۔ اور ان ذرائع میں تغیر کی وجہ سے جو نئے روابط معرضِ وجود میں آئیں وہی دوسرے وقت حق و صداقت کے پیمانے بن جاتے ہیں۔

مارکس کے نزدیک تو خیر مذہب انسانیت کے لیے افیون ہی ہے۔ لیکن اس کے وہ پیرو جنہوں نے مذہب دشمنی میں کسی قدر اعتدال پسندی کا ثبوت دیا، اُن کے نزدیک بھی اگر کوئی مذہب کسی قدر

قیمت کا حامل تھا تو وہ ایک خاص عہد اور ماحول میں تھا جس کے بدل جانے سے اُس کی افادیت یکسر ختم ہو گئی ہے۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں اسلام کا ذکر بھی اسی انداز سے آیا ہے کہ حضور سرکارِ دو عالمؐ کے عہد میں عرب سماج کے معاشی ڈھانچے میں جو تغیرات پیدا ہو رہے تھے حضورؐ نے ان کا اچھی طرح ادراک کر کے اُن کے تقاضوں کے مطابق عرب سوسائٹی کے اندر تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ اور یہی ان معتدل سوشلسٹوں کے نزدیک حضورؐ کا اصلی کارنامہ ہے۔ اُن کے اِن مذموم خیالات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لیے خداوند تعالیٰ کے منشا کو انسانیت پر واضح کرنے والے نہیں بلکہ اپنے دَور کی عرب سوسائٹی کے "انقلابی قائد" تھے، جنہوں نے معاشی میدان میں چند تبدیلیاں لا کر اُس زمانے کے حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔

اسلام کے بارے میں اس قسم کے خیالات پر غور کیجیے اور دیکھیے کیا کوئی شخص انہیں قبول کر کے مسلمان رہ سکتا ہے؟ جو "ازم" اس بات کا دعویدار ہو کہ ہر دَور کا اپنا الگ "قرآن" ہے اور جس کے نزدیک کسی نظریے اور عمل کی صحت کا سارا دار و مدار صرف اس بات پر ہے کہ وہ پیداوار کے اندر تغیرات کے ساتھ بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ ازم کسی ابدی پیغام یا کسی ابدی سچائی اور صداقت کا کس طرح علمبردار بن سکتا ہے؟

ہمیں اس وقت اس امر سے کوئی بحث نہیں کہ جو لوگ اس نظریہ کے حامی ہیں وہ خود اس کے کہاں تک پابند ہیں۔ ہمیں تو یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ایک مسلمان جس کا ایمان یہ ہے کہ اسلام انسانیت کے نام خدا کا پہلا اور آخری پیغام ہے اور جس میں قیامت تک کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ آخری پیغمبر ہیں جن کے ذریعہ قادرِ مطلق نے اپنے اس پیغام کے مضمرات قیامت تک حتمی صورت میں واضح کر دیئے، اِس بنا پر حضورؐ کی نبوت اصلاحِ معیشت کی کوئی عارضی اور وقتی تحریک نہیں بلکہ ہمہ گیر ہدایتِ الٰہی کا واحد سرچشمہ ہے، وہ اشتراکی خرافات پر کس طرح ایمان لا سکتا ہے؟ جو لوگ اس قسم کے باہم متصادم معتقدات کو ایک دوسرے کے ساتھ پیوست کر کے ایک مخلوطہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں وہ یا تو اناڑی ہیں یا پھر مرفوع القلم۔

اسلام کے خلاف ماضی میں بھی اعتراضات ہوتے رہے ہیں مگر اُن کی نوعیت زیادہ تر کلامی مسائل کی سی تھی۔ لیکن دورِ حاضر میں جس قدر اعتراضات ہو رہے ہیں اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں ذہنوں میں جو شکوک و شبہات پیدا کیے جا رہے ہیں وہ بیشتر تاریخ کی مادی تعبیر کی پیداوار ہیں۔ ان اعتراضات کی ساری عمارت اس غلط مفروضے پر اٹھائی گئی ہے کہ معاشی ماحول کے بدل جانے سے حق و صداقت کے معیارات بدل جاتے ہیں۔ چنانچہ اسلام پر اعتراضات کا اگر دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو آپ اُن کی تہ میں یہی غلط مفروضہ کارفرما پائیں گے۔ ہم یہاں چند اعتراضات بطورِ مثال نقل کرتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات کو وقتی اور عارضی اور دورِ حاضر کے لیے بیکار ثابت کرنے کی غرض سے یہ کہا جاتا ہے کہ آخر یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ کسی قدیم معاشرے کے اصولوں کو دورِ جدید کی ترقی یافتہ اور مہذب سوسائٹی پر ٹھونسنے کی کوشش کی جائے؟ اپنے اس اعتراض کے اندر وزن پیدا کرنے کے لیے یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ وہ لباس جو ایک چھوٹے بچے کے لیے تراشا جائے وہ ایک جوان آدمی کے جسم پر کس طرح راست آسکتا ہے اور اگر کوئی شخص ایسی کوشش کرے تو اس کے فاتر العقل ہونے پر کسے شبہ ہو سکتا ہے؟ دوسرے سارے اعتراضات درحقیقت اسی اعتراض کی مختلف فروعات ہیں۔ مثلاً اسلامی نظام ۳۰ سال تک کامیابی کے ساتھ چلا اور پھر انتشار کی نذر ہو گیا۔ اس اعتراض میں جو کچھ باور کرانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ۳۰ سال کے عرصے میں عرب کے اندر جو معاشی تبدیلیاں آئیں انہوں نے اس نظام کی افادیت کو ختم کر دیا اور معاشی تغیرات کی وجہ سے ایسے نئے تقاضے اُبھرے جو کسی نئے دین کے طالب تھے۔ اس کے علاوہ اسلام کو یہ بھی طعنہ دیا جاتا ہے کہ یہ بادشاہوں کی پشت پناہی کرتا ہے اور جاگیرداری اور سرمایہ داری کے لیے ڈھال کا کام دیتا ہے۔

اس طعنہ زنی کا مقصد یہ ہے کہ نوجوان نسل کے ذہن میں یہ باطل خیال بٹھا دیا جائے کہ اسلام ایک ایسا رجعت پسندانہ نظام ہے جسے دنیا کے ظالموں نے استحصال اور ناانصافی کے لیے بطورِ آلہ کار استعمال کیا اور اب تک کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس دین کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کے لیے نازل نہیں فرمایا بلکہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے استحصال اور اپنے ناجائز مفادات کے تحفظ کے لیے گھڑا ہے اور وہی آج تک اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس طنز میں ایک طرف تو اس دین کے بارے میں بوسیدہ اور ازکار رفتہ ہونے کا تاثر قائم ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ باطل

نقش بھی دل و دماغ پر ثبت ہوتا ہے کہ یہ دین آزادی، روشن خیالی، عدل و انصاف کا دشمن اور ظلم و استبداد کا مؤید اور حامی ہے؟

تاریخ کی مادی تعبیر جس کی اصل سے اعتراضات کی یہ ساری فروعات پھوٹتی ہیں، انسانیت اور انسانی ارتقاء کے نہایت گمراہ کن مطالعہ پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ معاشی حالات میں تغیر و تبدل سے معاشرتی زندگی بھی بعض اثرات قبول کرتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ ذرائع پیداوار ہی کسی معاشرے کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی تصورات کی صورت گری کرتے ہیں بہت بڑی جہالت ہے۔ اگر مارکس کے اس دعوے کو صحیح مان لیا جائے تو پھر ان تمام معاشروں میں فکر و عمل کی پوری ہم آہنگی پائی جانی چاہیے جن میں ذرائع پیداوار ایک قسم کے ہیں یا جو معاشی اعتبار سے ارتقاء کی ایک خاص سطح پر ہیں۔ لیکن تاریخ کے اوراق نہ صرف یہ کہ اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتے بلکہ اس کی پرزور تردید کرتے ہیں۔ اہلِ روم اور قرنِ اول کے مسلمان معیشت کے ایک ہی دور میں تھے مگر ان کے افکار و نظریات، ان کے اخلاقی معیارات، ان کے خوب و ناخوب کے پیمانوں اور ان کے معاشرتی اور سیاسی ڈھانچوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ان کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں کسی قسم کی مماثلت پائی جاتی ہو۔ دونوں ہر لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد تھے۔ اس تضاد کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ قوموں اور افراد کی تعمیر میں فیصلہ کن قوت معاشی نہیں بلکہ وہ مقاصد ہیں جن کے حصول کے لیے وہ جد و جہد کرتے ہیں۔ مقاصد کا اختلاف ان کے طرزِ عمل اور طرزِ فکر میں اختلاف پیدا کر دیتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ زندگی کے خارجی مظاہر خصوصاً اس کے معاشی حالات کسی قوم کے فکر و عمل کا ہیولیٰ تیار نہیں کرتے بلکہ اس کے عزائم اور مقاصد اس کی زندگی کی تشکیل کرتے ہیں۔

پھر اسلامی نظام کو لباس پر قیاس کر کے یہ فیصلہ صادر کر دینا کہ چونکہ بچپن کا لباس جوانی میں بیکار ہوتا ہے۔ اس لیے ہر وہ نظامِ حیات جس کا ماضی سے تعلق ہے وہ حال کے لیے بے سود ہے بلکہ ضرر رساں ہے، قیاس مع الفارق ہے۔ اسلامی نظامِ حیات اور لباس میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں، بلکہ اسے اگر انسانی زندگی کے کسی حصے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے تو روح ہے۔ جس طرح روح انسان

کے ساتھ برابر جاری و ساری رہتی ہے اور وہ کسی مرحلے پر بھی فرسودہ اور بیکار نہیں ہوتی۔ اسی طرح اللہ کا دین بھی ہر عہد اور ہر دور میں انسان کی پوری طرح رہنمائی کرتا ہے۔ وہ کبھی بوسیدہ نہیں ہونے پاتا۔ اس بات کی ضرورت البتہ ہر منزل پر رہتی ہے کہ روح کی طرح اللہ کے دین کو بھی ہر قسم کی آلودگی سے پاک رکھا جائے، تاکہ وہ پوری قوت کے ساتھ انسانی جسم کی توانائیوں کو کسی اچھے کام میں لگا سکے۔

اسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو جتنا تاریخی تسلسل اللہ کے دین میں پایا جاتا ہے کسی دوسرے نظریۂ حیات میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ جو لوگ مذہب یا کسی نظامِ حیات کو لباس پر قیاس کر کے انسانی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں ان کے نزدیک ماضی کی ہر چیز واقعی عبث اور بیکار ہے۔ لیکن جو لوگ ہدایتِ الٰہی کو انسانیت کے لیے بمنزلہ روح سمجھ کر اس کے ارتقاء کا جائزہ لیتے ہیں، وہ پوری تاریخ کو حق و باطل کی ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش پاتے ہیں جس میں انسان ماضی سے سبق اور عبرت حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ ماضی ہی میں اللہ تعالیٰ نے اُن بزرگ و برتر ہستیوں کو دنیا میں مبعوث فرمایا جنہوں نے اس کشمکش میں مثالی کردار ادا کر کے انسانیت کو یہ بتایا کہ حق کی کس طرح حمایت کرنی چاہیے اور باطل کے خلاف کس عزم، ہمت اور تدبّر سے صف آرا ہونا چاہیے۔

تاریخ کی مادّی تعبیر پر ایمان رکھنے والوں کے لیے تو ممکن ہے کہ انہیں ماضی میں سوائے جہالت اور استحصال کے اور کچھ نظر نہ آتا ہو لیکن وہ قوم ماضی کو کس طرح نظر انداز کر سکتی ہے جسے ان گزرے ہوئے ادوار میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں انسانیت کا سب سے ارفع اور اعلیٰ نمونہ ملا ہو اور جس کی پیروی کر کے ہی اس نے زندگی کے ہر گوشے میں غیر معمولی طور پر نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہوں۔ اس قوم سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ ماضی کی طرف دیکھنا چھوڑ دے بہت بڑی حماقت ہے۔ تاریخ درحقیقت انسانی حافظے کا دوسرا نام ہے۔ اُس شخص کے لیے تو بلاشبہ یادِ ماضی عذاب ہے جو اپنے حافظے میں سوائے گھناؤنے جرائم کے اور کوئی چیز محفوظ نہیں پاتا لیکن وہ شخص اپنے ماضی کو کس طرح بھلا دینے پر آمادہ ہو سکتا ہے جس کے حافظے میں پاکبازی، شرافت، دیانت، عدل و انصاف اور خدمتِ انسانیت کی لاتعداد قندیلیں فروزاں

ہوں۔ ان قندیلوں کی روشنی سے تو وہی شخص خوف زدہ ہو کر انہیں شعور کی نظروں سے اوجھل رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کی فطرت مسخ ہو جانے کی وجہ سے پاکبازی کے مقابلے میں ہوسناکی سے، شرافت کے مقابلے میں رذالت سے، عدل و انصاف کے مقابلے میں ظلم و استبداد سے اور خدمتِ انسانیت کے مقابلے میں عیاری چالاکی اور زبردست آزاری سے ایک گہرا لگاؤ پیدا ہو چکا ہو۔ اسلام نے مسلمانوں کے شعور میں تاریخی تسلسل کے جو گہرے اثرات مترتب کیے ہیں ان کے نقوش اسلامی تہذیب اور معاشرت کے ہر گوشے میں نہایت واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہم یہاں صرف قانون سازی کے دائرے میں ان اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں آزادی اور اصلاحِ احوال کی بے شمار تحریکات نے مختلف ادوار میں جنم لیا، لیکن کبھی بھی ان کے ہاں یہ سوال زیرِ بحث نہیں آیا کہ آزادی کے بعد یا اصلاحِ احوال کی کسی تحریک کے کامیاب ہو جانے کے بعد وہ کن مقاصد کی تکمیل کریں گے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اُن کے مقاصد روزِ اوّل سے متعین ہیں اور مسلم سوسائٹی کے ہر فرد کے قلب و دماغ کی لوح پر یہ مقاصد اسی وقت ثبت ہو جاتے ہیں جب وہ دنیا میں آنکھ کھولتے ہی اذان کی آواز سنتا ہے۔

باقی ممالک کو تو فی الحال جانے دیجیے، صرف اِس نیم برِ اعظم کی تاریخ پر نگاہ ڈال کر دیکھیے کہ مسلمانوں میں اصلاحِ احوال کے لیے کتنی تحریکیں اُبھریں۔ ان تحریکوں کے طریقہائے کار میں بھی نمایاں اختلافات رہے۔ لیکن ان کے مقاصد میں کبھی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ ان سب کے پیشِ نظر ایک ہی مقصد تھا کہ مسلمانوں کی زندگی ہر لحاظ سے اُس نقشے کے مطابق مرتب ہونی چاہیے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ خود تحریکِ پاکستان اسی ایک مقصد کی تکمیل کے لیے شروع ہوئی اور پروان چڑھی۔ اور قیامِ پاکستان کے بعد پوری قوم نے قرارداد مقاصد کی صورت میں اس حقیقت کو آئینی طور پر تسلیم کیا کہ مسلمانوں کے الگ خطۂ ارضی کے مطالبہ کا مقصد صرف ایک ہی تھا کہ وہ اس ملک میں اسلامی نظام کو برگ و بار لاتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ پچھلے دنوں عدالتِ عظمیٰ نے جو معرکۃ الآرا فیصلہ صادر کیا ہے اس میں بھی فاضل ججوں نے اس بات کی واضح نشاندہی کی ہے کہ قراردادِ مقاصد اس ملک کی اصل سمت ہے جس طرف اُسے بڑھنا چاہیے۔ اس بنا پر آج جو کوئی بھی اسلامی نظام کے نصب العین سے انحراف کرتا ہے۔ وہ درحقیقت اس ملک اور اس قوم کا سب سے بڑا بدخواہ ہے۔

(باقی صفحہ ۴۶ پر)

تفصیل ملتی ہے۔ دوسرے باب میں حدیثِ نبوی پر قدیم و جدید معترضین کے اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے اور تحقیق کے خوب جوہر دکھائے گئے ہیں۔ کتاب کا یہ حصہ سب سے زیادہ جاندار ہے اور تقریباً سوا تین سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ تیسرے باب میں قرآن و حدیث کا باہمی تعلق اور احکامِ قرآن و سنت کے نسخ سے متعلق بعض مباحث بالاختصار ملتے ہیں۔ آخر میں ائمہ اربعہ اور صحاح ستہ کے مؤلفین کے مختصر حالاتِ زندگی درج کیے گئے ہیں۔

کتاب کے اوّل و آخر میں کہیں بھی فصول و ابواب کی صفحہ وار فہرست نہیں دی گئی جس سے اخذ و استفادہ میں دشواری پیش آتی ہے۔

حدیثِ رسولؐ کا تشریعی مقام، بلاشبہ ان چند بہترین کتب میں سے ایک ہے جن میں حجیّتِ حدیث کا اثبات کرتے ہوئے مخالف حلقوں کے اعتراضات کا علمی جواب دیا گیا ہے۔ اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ تالیف اسلامی لٹریچر میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ جناب غلام احمد حریری کا اردو ترجمہ نہایت شگفتہ اور رواں ہے۔ اس پیش کش پر مصنف، مترجم اور ناشر سبھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(بقیہ اشارات)

اسے ہماری بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہم جن نمائندوں کو اس غرض کے لیے منتخب کرتے ہیں کہ وہ قرار دادِ مقاصد کی روشنی میں ملک اور قوم کو آگے بڑھائیں وہ اس متعین نصب العین کو نظر انداز کر کے بعض ایسے مقاصد کی تکمیل کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیتے ہیں جو اس نصب العین کی بالکل ضد ہیں۔ کیا اس طرزِ عمل کو کوئی باضمیر شخص پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے؟ تمام وہ ممالک جن میں جمہوری نظام رائج ہے وہاں عوامی نمائندے انتخابات کے ذریعے بدلتے رہتے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی انتخاب میں کامیاب ہونے والے نمائندوں نے ان تصورات ہی پر تیشہ زنی کا عمل شروع کر دیا ہو جو ان ممالک اور قوموں کے

لیے بنیاد کی اہمیت رکھتے ہیں۔ نمائندوں کا کام عوام کی نمائندگی کرنا ہے۔ انہیں یہ حق کسی صورت بھی نہیں پہنچتا کہ وہ عوامی آرزوں اور تمناؤں کو بروئے کار لانے کے بجائے ان آرزوؤں اور تمناؤں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے لگیں۔

ہم موجودہ ارکانِ اسمبلی کو اُن کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے بڑے واضح الفاظ میں یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنی حدودِ کار کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس ضمن میں کوئی ایسا اقدام نہ کریں جو اُن کی آئینی حدود سے متجاوز ہو۔ وہ جس اسمبلی کے ارکان ہونے کے دعویدار ہیں اس کی ہیئتِ ترکیبی ہی محلِ نظر ہے۔ قومی اسمبلی کی اکثریت مشرقی پاکستان سے تعلق رکھتی ہے جسے ابھی تک آئینی اعتبار سے پاکستان کا حصہ ہی تسلیم کیا جا رہا ہے۔ مشرقی پاکستان کے ارکانِ اسمبلی کی تعداد ۱۷۸ ہے جبکہ مغربی پاکستان میں یہ تعداد ۱۴۴ ہے۔ اس صورت میں اگر ہم ۱۷۸ ارکان کے پاس کردہ دستور کو مسترد کرنے کے مجاز ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ۱۴۴ ارکان کے پاس کردہ مسودۂ دستور کو مسترد نہ کر سکیں۔ لیکن ۱۴۴ ممبروں کے اس حق کو تسلیم کرنے کے بعد کہ وہ بنیادی تبدیلیوں کا فیصلہ کر سکتے ہیں ہم ۱۷۸ کے اس حق کو ماننے سے کیسے انکار کر سکتے ہیں کہ وہ پاکستان ہی کے ٹکڑے کر ڈالنے کے مجاز ہیں؟

پھر اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ موجودہ اسمبلی لیگل فریم ورک آرڈر (قانونی ڈھانچے) کے تحت بعض ایسی بنیادی شرائط کے ساتھ معرضِ وجود میں آئی ہے جن کی پابندی اس پر ہر حال میں لازم ہے، اور ان شرائط کو توڑنا تو کیا وہ اُن کے خلاف سوچنے کی بھی مجاز نہیں، کیونکہ تمام پارٹیوں نے اس لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت انتخابات میں حصہ لیا تھا اور وہ ووٹروں اور ان پارٹیوں کے درمیان ایک معاہدے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اسمبلی اس قانونی ڈھانچے کی رُو سے دو باتوں کی پابند ہے۔ ایک یہ کہ وہ چار ماہ کے اندر تدوینِ دستور کا کام مکمل کرے اور دوسرے یہ کہ وہ دستور اسلام کے عین مطابق ہو۔ اب اگر یہ اسمبلی ان دو بنیادی شرائط کو توڑتی ہے تو وہ خود بخود کالعدم قرار پاتی ہے۔ بعض لوگ اس موقف کے بارے میں یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ چونکہ عدالتِ عظمیٰ کے فیصلے کے مطابق سابق صدر یحییٰ کو غاصب قرار دیا گیا ہے اس لیے اس کا قانونی ڈھانچہ بھی بیکار بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر

اس اعتراض کو صحیح مان لیا جائے تو پھر موجودہ اسمبلی کا وجود ہی باقی نہیں رہتا کیونکہ جس انتخاب کے نتیجے میں موجودہ ارکانِ اسمبلی منتخب ہوئے ہیں وہ بھی اس غاصب کے تاریک عہد کا کارنامہ ہے۔

ہم نے عبوری آئین کی تدوین کے وقت ارکانِ اسمبلی کی خدمت میں یہ گذارشات پیش کرنے سے اس وجہ سے احتراز کیا تھا کہ ہم یہ سمجھتے تھے کہ اس اسمبلی اور اس کے ارکان کو اپنی حدودِ کار اور اپنی ملّی ذمہ داریوں کا اچھی طرح احساس ہوگا لیکن اِس آئین کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ہمارے اس اعتماد کو خاصا دھچکا لگا اور یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس اسمبلی کے بعض "من چلے" ارکان نشۂ اقتدار میں اس حد تک بہک گئے ہیں کہ وہ عوام کی نمائندگی کا مقدس فرض ادا کرنے کے بجائے اپنی ذاتی آراء کو قوت کے زور پر اس ملک میں مسلّط کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جو عبوری آئین سامنے آیا ہے اُسے دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی ہے۔ اس میں نہ تو اسلام کو دستور کی بنیاد اور اساس قرار دیا گیا ہے اور نہ ان اصولوں کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے جو قانونی ڈھانچے میں طے کیے گئے تھے، بلکہ عوام کی گردنوں میں ایک ایسے آئین کا قلادہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جس کا تانا بانا آمریت نے تیار کیا ہے۔ مرکز میں صدارتی نظام اور وہ بھی بڑے وسیع اختیارات کے ساتھ، اور صوبوں میں پارلیمانی نظام غیر معمولی حدود و قیود کے ساتھ۔ اگر اس ملک میں آمریت کو مسلّط کرنے کا پیش خیمہ نہیں تو اور کیا ہے؟

ان حالات میں ہم ارکانِ اسمبلی سے اور خصوصاً ان لوگوں سے جو اقتدار سے وابستہ ہیں بڑی دلسوزی سے یہ عرض کرتے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریوں اور اپنے حدودِ کار کا اچھی طرح احساس کریں اور ملک کے لیے کسی ایسے دستور کی تدوین کریں جو اسلامی نظامِ حیات کا ہر لحاظ سے مظہر ہو تاکہ اس ملک میں ان مقدس آرزوؤں کی تکمیل ہو سکے جنہیں پورا کرنے کے لیے اس نیم برِ اعظم کے مسلمانوں کو ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ آگ و خون کے سمندر سے گزرنا پڑا ہے۔ اگر خدانخواستہ انہوں نے اپنے اس فرض میں کوتاہی کی یا اپنے حدود سے تجاوز کرتے ہوئے قوم پر کسی غیر اسلامی اور غیر جمہوری آئین کو ٹھونسنے کی کوشش کی تو یہ قرار دادِ مقاصد سے غداری ہوگی جس کے بعد اسمبلی کے قائم رہنے کا کوئی جواز باقی نہ رہے گا۔